جہاد، دہشت گردی اور دینی مدارس کا عمومی کردار

محمد حمزہ

ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

Abstract:

In this article the issues of Jihad, terrorism and the role of religious seminaries have been discussed specially after 9/11. It has been found that there is no relationship in these three. Jihad is basically for the defence of Islam and may become obligatory for a Muslim. While the terrorism has no specific noble cause and even there is no specific definition of terrorism. In many cases a freedom fighter of a nation is terrorist of other nation.

This is why different nations usually use the term terrorist for their opponents. Of course this is not justified. In this article the relationship between terrorism and religious seminaries has been discussed in detail. Generally religious seminaries are for religious education. Common people have soft corner for these seminaries and they help them to run. After 9/11 terrorism has become a popular term around the world and religious seminaries were targeted as the nurseries of terrorism in different countries like Afghanistan and Pakistan. It was due to the involvement of some madressahs in Afghan war. In this new scenario religious seminaries started countering the allegations against them. In this way the issue has been divided into three phases hence have been discussed in this article in three stages: First Phase:In this phase Jihad has been discussed as

an Islamic teaching and presented in simplified manner. Some unique interpretations of some jihadi groups have also been criticized and pure Islamic values have been emphasized. Second Phase:In this stage the issue of terrorism has been discussed. Generally terrorism means killing and terrorizing people or attacking on lives and properties of civilians. Tagging this terrorism with Islam and Muslims is itself seems to be a conspiracy against a religion of peace and prosperity where killing of entire human of one human being is called killing being. Third Phase:In this phase the role of religious seminaries has been discussed in length, specially ideological and spiritual aspects have been highlighted. During discussion a critical approach has been maintained so that some doubtful role of some seminaries could been included.

Keywords:Jihad,Terrorism,ReligiousSeminaries,Madressah, 9/11

عصر حاضر کی مسلم ریاستیں اور مسلمان اس الزام کے بعد کہ وہ دہشت گرد ہیں اور جہاد کے نام پر انسانیت کا قتل کر رہے ہیں جبکہ اس نظریئے کو بنیاد فراہم کرنیوالے دینی مدارس ہیں، ایک دفاعی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ حالاں کہ دینِ اسلام کی تعلیمات اس بات کی غماز ہیں کہ اِس دین میں کسی بے گناہ انسان کو قتل کرنا گویا ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کرنا، اتنی وسیع اور عام فہم تعلیمات کے باوجود مسلمان قوم کو جہاد جیسے عظیم فلسفہ سے ہٹا کر ایک انسانیت سوز جرم ''دہشت گردی'' کی طرف نسبت دینا ایک سوچی سمجھی سازش کے سوا کوئی اور پہلو نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ کہ مسلمانوں کے جو ادارے ایک مسلم معاشرے کے لیے سانس اور سائنس کی حیثیت رکھتے ہیں اُن کو ''دہشت گردی کی نرسریاں'' قرار دینا عقل وفہم سے ماورا ہے۔ نائن الیون حادثہ کے بعد تین نظریات بہت زیادہ شدومد کے ساتھ پھیل گئے۔ پہلا نظریہ جہاد کے بارے میں تھا کہ مسلمانوں کے ہاں جہاد کے نام سے جو جنگ یا معرکہ رائج ہے وہ دراصل انسانیت کو قتل کرنے کا ایک پروانہ ہے۔ یہ الزام عام طور پر مخالفینِ اسلام خصوصی طور پر امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے لگایا گیا۔ اس الزام کا اولین فریقین امریکہ بظاہر زخم خوردہ تھا۔ نائن الیون جیسے بڑے حادثے کے بعد امریکہ کی طرف سے اس طرح کے الزامات عائد کرنا ایک فطری اَمر تھا۔ نائن الیون حادثے کے بعد کئی طرح کے اقدامات کئے گئے اور کم سے کم

اقدام یہ تھا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی جانیں خطرے میں پڑ گئی، مختلف اداروں جیسے مساجد اور اسلامک سینٹرز پر حملے کئے گئے جب کہ املاک کو بھی جلایا گیا۔ یہ امریکی عوام کی طرف سے نائن الیون حادثے کا ابتدائی ردِعمل تھا، بعد کے ادوار میں عمومی اقدامات کا آغاز کیا گیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عراق اور افغانستان میں جنگوں کے نتائج کیا نکلے، قتلِ عام کس قدر ہوا، اور مسلمانوں کے نظریات خاص کر قرآن مجید جیسے عظیم کلام کے بارے میں لب کشائی کرنے کی جسارت کی گئی۔ امریکہ اور دیگر اقوام کے تئیں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ''دہشت گردوں'' کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہے؟ اُنہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں میں بعض نظریات ایسے ہیں جو دہشت گرد اور دہشت گردی پیدا کرنے کے سبب بنتے ہیں۔ منجملہ ان میں سے ایک یعنی ''جہاد'' کو انتخاب کیا گیا اور خیال کیا گیا کہ جہاد کو پھیلانے اور اس کی پرچار کرنے والے زیادہ افراد مدارس کے طلبہ ہیں اور یہی وہ طلبہ ہیں جو دُنیا کے امن کو خراب کرنے کے باعث بنتے ہیں۔ دوسرا فریق اسرائیل تھا جو اپنے وجود سے لے کر اب تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کی سی کیفیت میں کھڑا ہے۔ اسرائیل کو ایک بھرپور موقع چاہیے تھا کہ کسی طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جا سکے۔ لہٰذا نائن الیون جیسے حادثے نے اسرائیل کو شہ دی اور وہ ہر اُس قوم کا ممبر یا مددگار بنا جو مسلمانوں کے خلاف عزائم رکھتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کی طرف سے نام ونہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اعلان کے بعد اسرائیل کی طرف سے بھرپور معاونت کا اعلامیہ جاری کیا گیا۔ یہ یقینی بات تھی کہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کی جانب سے اعلانِ جنگ کے بعد اسرائیل کا پُرمسرت ہونا ایک لازمی اَمر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق اور افغانستان جنگ میں اسرائیل کی طرف سے معاونت کے علاوہ بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ کی گئی۔ اب امریکہ اور اُس کے اتحادی اور اسرائیل جیسے دشمنوں کے لیے کھلا میدان تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے عقائد اور اداروں کی طرف انگلیاں اُٹھانی شروع کر دیں۔ اولین ادارے جو ان قوتوں کے ہدفِ تنقید رہے وہ دینی مدارس تھے۔ ان کے بارے میں یہ نظریہ منظرعام پر آیا کہ یہاں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں دہشت گرد اور شدت پسند پیدا ہوتے ہیں۔

مبحثِ اول جہاد:

ہر وہ عمل اور سعی وکوشش جہاد ہے جو دین کی تنفیذ، اشاعت وتبلیغ، تحفظ اور دفاع کے سلسلہ میں کی جائے۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو دو قسم کی صورتوں کا سامنا ہوگا۔ ایک صورت تو اسلامی ریاست کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی اساس پر قائم ہوئی لہٰذا اسے اللہ کی حاکمیت کے اُصول پر نافذ کرنا ہے اور اُسے توسیع دینا ہے۔ غلبہ دین کیلئے اپنا دائرہ اثر کو وسیع کرنا اور طاغوت کی حاکمیت سے انسانوں کو نجات دلانا دعوت اسلامی کا اہم پہلو ہے۔ اس کیلئے کبھی طاقت کے استعمال کا موقع پیدا ہوتا ہے اور اسلامی ریاست کو اس کیلئے اقدام کرنا پڑتا ہے۔ اس

طرح کا اقدام جہاد کہلاتا ہے اور اس کے مقاصد میں کافرانہ نظام کے سیاسی غلبے کو توڑنا ہے۔ کفر چونکہ ظلم وفساد ہے اس لئے محدود کرنا ضروری ہے اور عہد شکنی بھی اسلامی ریاست کیلئے موقع مہیا کرتی ہے کہ وہ جہاد کیلئے اقدام کرے۔ اقدامی جہاد کیلئے ریاست کا ہونا ضروری اور امیرالمومنین کی اجازت اور رہنمائی بھی ضروری ہے۔ دوسری صورت مسلم معاشرے کی ہے۔ ریاست کا وجود وعدم وجود برابر ہے۔

مسلم معاشرے کو ظلم وفساد کا سامنا ہے اس کے حقوق پامال ہورہے ہیں، جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں ہے ایسے میں دفاع کا حق حاصل ہے اور یہ دفاعی جہاد ہے اس کیلئے ریاست سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ مسلم معاشرے کے افراد اگر اجتماعی قیادت رکھتے ہیں تو اس سے مشورہ ہوسکتا ہے لیکن ظلم وفساد کی صورت میں جہاد واجب ہوجاتا ہے۔ قرآن وسنت میں اگرچہ دونوں صورتوں کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں لیکن گہری نظر رکھنے والا انسان ان صورتوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ مسلمان اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں وہ دفاعی جہاد کے متقاضی ہیں۔ دشمن ملکوں اور شہروں پر حملہ آور اور قابض ہیں۔ مسلمانوں کے بنیادی حقوق پامال ہورہے ہیں لہٰذا انہیں دفاع کا حق ہے اور ایسے حالات میں جہاد فرض ہوجاتا ہے۔ کوئی شخص یا جماعت اپنے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد میں ماری جائے تو وہ شہید ہے۔ سعد بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**من قتل دون ماله فهو شهيد و من قتل دون دينه فهو شهيد و من قتل دون دمه فهو شهيد و من قتل دون اهله فهو شهيد** ''[1] ''جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے جو اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے جو شخص اپنی ذات کو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے اور جو اپنے عیال کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔''

ایک مسلم معاشرے میں دیگر دینی فرائض کے ساتھ ساتھ جہاد کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے تاکہ اللہ کے احکام کے مطابق فریضہ جہاد کو صحیح طور پر ادا کیا جاسکے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**من يرد الله به خيراً يفقهه فى الدين.** ''[2] ''جس شخص کے لیے اللہ بھلائی چاہتا ہے اس کو دینی علم ودانش عطاء فرماتا ہے۔'' بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ ہر قول وعمل سے پہلے علم حاصل کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ کا فرمان ہے: ''**فَاعْلَمْ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اَلَّا اللّٰه...** ''[3] ''(اے نبیؐ) اس بات کا علم حاصل کرلو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

مزید برآں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''**من سلک طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا الى الجنة** ''[4] ''جو کسی راہ میں علم طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت کی راہ آسان کرتا ہے۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف جہاد ہی حتمی نظریہ نہیں بلکہ دیگر دینی ضرورتوں پر عمل پیرا ہونے کا نام اسلام ہے۔ جہاد ایک دفاعی امر ہے وہ اُس صورت میں جب دشمن حملہ آور ہونے کی کوشش کرے یا حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی

قدم اُٹھائے۔ ذیل میں ہم جہاد کو لغوی اور اصطلاحی معنوں میں بیان کرتے ہیں، لغوی اعتبار سے جہاد کے دو معانی ہیں:

(۱) جَھَدَ، اُس نے پوری طاقت کو صرف کیا۔ اس لحاظ سے جہاد کا معنی ہے: ''**بذل الطاقة والوسع او هوا المشقة**'' ۵ پوری طاقت وقوت کو کھپا دینا یا مشقت برداشت کرنا۔

(۲) ''**القتال مع العدو**''، ۶ دشمن کے ساتھ لڑنا جہاد کا شرعی معنی خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ حضرت عمرو بن عبسہ فرماتے ہیں: **قال رجل: يا رسول الله وما الجهاد؟ ان تقاتل الكفار اذا لقيتهم** ۷ ایک شخص نے سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ جہاد کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جہاد یہ ہے کہ تو کفار کے مقابلہ میں جنگ کرے۔

مطلقاً جہاد کا لفظ شریعت اسلامیہ میں صرف جنگ بمقابلہ کفار کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے اور یہی جہاد اسلامی کوہان کی چوٹی اور اعلاء کلمۃ اللہ جیسے بلند ترین مقصد کا اصل موجب ہے۔ ہمارے مطابق محدثین اور فقہائے اسلام کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں کتاب الجہاد کے تحت مذکورہ ابواب میں بالعموم قتال بالکفار کی آیات واحادیث ہی بیان کی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جہاد کی غرض وغایت کیا ہے؟ ایک مسلمان اس سوال کا جواب بالکل سادہ الفاظ میں دے سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کے احکامات یونہی وضع نہیں ہوئے بلکہ ایک خاص مقصد اور غرض وغایت کے تحت وضع ہوئے ہیں۔ جہاد بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے اور یقیناً اس کا بھی مقصد اور غرض وغایت ہے۔

جہاد کی غرض وغایت یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے کلمہ کو یعنی دینِ اسلام کو تمام ادیان پر بلند اور غالب کیا جائے اور آخرت میں اللہ کی تیار کی ہوئی جنت کو حاصل کیا جائے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے ضمن میں مظلوم ومقہور اور مجبور و بے بس لوگوں کی نصرت، اسلامی ممالک اور علاقہ جات کا تحفظ، اللہ کے دشمنوں کے غلبہ اور قبضہ سے مقبوضہ علاقہ جات کو آزاد کرانا، اموالِ غنیمت کا حصول، حصولِ جنت کے ضمن میں صغیرہ وکبیرہ گناہوں کا کفارہ، حصول اجر وثواب اور مذکورہ بالا تمام بلند مقاصد کے لیے اللہ کی ضمانت کا حصول، اس جیسی اغراض شامل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا جہاد کا تصور صرف اسلام میں ہے؟ دُنیا کے دیگر مذاہب میں جہادا کا کوئی تصور ہے؟ اگر ہم باریک بینی سے دیگر مذاہب کی تعلیمات کی طرف نظر کریں تو ہمیں اُن مذاہب میں بھی جہاد کا تصور واضح نظر آتا ہے۔ ہندو مت کو اپنے اُصول ''اہنسا''، جس کا مطلب ہے ''کسی کو نہ مارنا'' پر بڑا ناز ہے لیکن حقیقتاً اس پر وہ کتنا عمل کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی صحیفوں میں محض ''سیتا'' کے لیے کتنے ''لنکا'' ڈھائے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہندو مت کے مقدس صحیفے دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق متضاد بیانات لئے ہوئے ہیں ویسے ہی جہاد وقتال پر بھی تضاد نمایاں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ''گیتا'' کی تعلیم سے متعلق لکھتے ہیں: آج ہر فلسفہ اور فکر کے مختلف مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے

ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ گاندھی جی اپنے عقیدہ اہنسا کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو اہنسا (تشدد) اور جنگ کا جواز بھی اس سے ثابت کرتے ہیں۔''۸

یہ تو ہندوؤں کا نظریہ ہے۔ اُن کے ہاں امن و شانتی کو بڑا مقام حاصل ہے۔ کسی جانور کو مارنا بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جب دفاعی اُمور کی ضرورت ہوتی ہے تو ہر مذہب و مسلک میں جہاد جیسا نظریہ یا تصور نظر آتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں کے ہاں بھی جہاد کا نظریہ واضح نظر آتا ہے۔ یہودی قوم نہ صرف خود کو دُنیا کی بہترین قوم گردانتی ہے بلکہ خود کو خدا کی چہیتی کہلانا پسند کرتی ہے۔ اُن کے ہاں جہاد کے اُصول کچھ یوں ملتے ہیں: ''تم ان سے یہ سلوک کرنا کہ ان کے مذبحوں کے ڈھا دینا، ان کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور ان کی بسیرتوں (باغوں) کو کاٹ ڈالنا اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دینا۔''۹

عیسائیوں کی تعلیمات میں بھی جہاد کا تصور عام پایا جاتا ہے۔ عصر حاضر میں چوں کہ عیسائی مسلمانوں کا ایک غیر ارادی فریق ہے جو اس بات کا پرچار کرتا ہے کہ اسلام لوگوں کو دہشت گردی سکھاتا ہے اور مسلمان دہشت پسند قوم ہے۔ لیکن جب ہم اُن کی تعلیمات کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہاں ہمیں واضح طور پر جہاد کے تانے بانے ملتے ہیں جیسا کہ عیسائیوں کی مقدسات میں حضرت عیسیٰؑ سے منسوب یہ جملے ملتے ہیں: ''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں کیوں کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔''۱۰

لیکن اس کے برعکس جب ہم قرآن کی تعلیمات اور دینِ محمدی کے احکامات پر نظر کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ایک نرم لہجہ اور رحم کا عظیم حکم نظر آتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

'' و قاتلو فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم و لا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین''۱۱

''اور تم اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادہ نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

قرآن مجید ایک اور مقام پر مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی فریق تم سے صلح کی خواہش کا اظہار کرے تو یقیناً صلح کرو کیوں کہ اللہ کی ذات اس صلح کے پس پردہ موجود ہے۔ یعنی بھروسہ اللہ پر رکھنا تاکہ صلح کے اثرات اور ثمرات مسلمانوں کے حق میں مل سکیں۔ قرآن کہتا ہے: **''وَإِن جَنَحُوا۟ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ''**۱۲ ''اور اگر وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں تو تم بھی تیار ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک وہ سب سے زیادہ سننے والا ہے''

فتحِ مکہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے جو احکامات صادر فرمائے ان میں سے چند ملاحظہ کیجئے کہ اسلام کس قدر

امن پسند مذہب ہے اور وہ جہاد کو ایک خاص موقع پر جائز سمجھتا ہے بلکہ فرض سمجھتا ہے اور وہ خاص موقع دفاعی ہے۔ ذیل میں ہم اُن احکامات کی مختصر فہرست بیان کرتے ہیں:

☆ جو کوئی ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

☆ جو کوئی شخص خانہ کعبہ کے اندر پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔

☆ جو کوئی شخص اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے، اسے قتل نہ کیا جائے۔

☆ بھاگ جانے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

☆ زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔

☆ اسیر کو قتل نہ کیا جائے۔(۲۰)

کیا دنیا کا کوئی ایسا مذہب ہے جو اسلام سے بڑھ کر جنگ وقتال کے ایسے عمدہ اُصول وضع کرتا ہو؟ اس بات میں کیا شبہ ہے کہ اسلام ہی دنیائے عالم کا واحد دین ہے جو جامعیت وکاملیت رکھتا ہے۔ اس کے سنہری اُصولوں کو ہر شعبہ ہائے زندگی میں بلکہ دُنیا کے ہر دستور میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو جہاد سے متعلق تھی جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ جہاد کا مقصد صرف جنگ وجدل نہیں بلکہ دیگر اُمور پر بھی عمل کرنے کا نام جہاد ہے۔ صرف دشمن کے خلاف میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار رہنے کا نام جہاد نہیں ہے۔ اپنے نفس کے خلاف جدوجہد کرنے کا نام بھی جہاد ہے، معاشرے میں پسے ہوئے لوگوں کے حقوق کیلئے آوازِ حق بلند کرنے کا نام جہاد ہے، برائی کے خلاف سینہ سپر ہونے کا نام جہاد ہے۔ ان کاموں کے خلاف کھڑے ہونے والے افراد دہشت گرد کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس طرح کے اُمور تو تمام مذاہب میں بھی اچھی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پھر اسلام کے ماننے والوں کو ہدفِ تنقید بنانا کہاں کا انصاف ہے؟ معلوم ہوا کہ جہاد کو من چاہے مقاصد کیلئے استعمال کرنا کسی بھی طرح سے دُرست نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے انفرادی فعل سے اس طرح کا کوئی بھی عمل مترشح ہوتا ہے تو یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے اور وہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ انسانیت کے بھی خلاف ہے۔

مبحثِ دوم دہشت گردی:

دہشت گردی کوئی نئی اصطلاح نہیں۔ زمانہ قدیم سے ہی اس کے آثار مختلف شکلوں میں موجود تھے۔ یوں تو اس مفہوم کی فی الواقع تعریف بیان کرنا مشکل ہے، البتہ تمام جزئیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ایک ہی نکتہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بے جرم وخطاء کسی انسان کو قتل کرنا، ستانا، ظلم ڈھانا، خوف وہراس پھیلانا اور نہتے لوگوں پر حملہ کرنا دہشت گردی ہے۔ مفکرین نے بھی دہشت گردی کی مخصوص تعریف سے اجتناب کرتے ہوئے صرف لفظ ''دہشت'' کی

وضاحت کی ہے۔ بعض کے نزدیک دہشت گردی کی اصلاً کوئی تعریف ہے ہی نہیں۔ ''ایک شخص کا ہیرو دوسرے شخص کیلئے دہشت گرد ہوسکتا ہے اور دوسرے شخص کا دہشت گرد پہلے شخص کیلئے ہیرو یعنی مجاہد ہوسکتا ہے۔''(۱۳) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دہشت گردی کی کوئی تعریف نہیں تو پھر ہم دہشت گردی کی شناخت کیسے کریں اور اس عمل کے مرتکب شخص کو کس نام سے پکاریں؟؟ کسی لفظ کا ظہور تبھی ہوتا ہے جب مفہوماً اور مستعملاً اس کا وجود ہو۔ اگر ہم یہ کہہ کر کہ ''لفظ دہشت گردی کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی''، اس کو مبہم چھوڑ دیں تو پھر خوف و ہراس اور معاشرے میں بدامنی پھیلانے والوں کو کس نام سے پکارا جانا چاہیے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم کسی ایسے نقطہ نظر کی طرف ملتفت ہوں جو دہشت گردی کی تعریف فی البدیہہ یا فی الواقع نہ صحیح مجملاً تو اس کی وضاحت کر سکے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں دہشت گردی کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے: ''دہشت گردی کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے حکومت، عوام یا کسی فرد کے خلاف منظّم طور پر خوف و ہراس یا ناقابل تصدیق تشدد کا نام ہے۔''۱۴؎

سیاسی نظام میں خلل پیدا کرنے والے محرکات کو دہشت گردی کہا گیا ہے، جبکہ قوم پرستی، انقلاب اور حکومتی مشینری کی طرف سے روا رکھے گئے سلوک کو بھی دہشت گردی کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ قوم پرستی، لسانیت، انقلابات اور حکومتی کردار کو الگ سے بیان کرنے کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اصل مدعا یعنی سیاسی نظام میں خلل اندازی کو ہی دہشت گردی جانا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی کتاب میں مزید لکھا گیا ہے ''سیاسی تنظیمیں اپنے قدامت پسندانہ اور جدت پسندانہ اہداف کے حصول کے لیے دہشت گردی کرتی ہیں۔ اسی طرح قوم پرست، نسلی ولسانی گروہ، انقلاب پسند گروہ اور خود حکومتی فوج اور خفیہ پولیس بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرتی ہے۔''۱۵؎

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف سیاسی مقصد کا حصول ہی کیوں؟ کیا مذہبی، معاشی، معاشرتی وغیرہم کے مقاصد کا حصول کسی بھی طرح سے ممکن ہو، جائز ہے؟ انسان کے اولین وجود سے لے کر اب تک جینا اور صرف اپنی بقاء کا معاملہ نازک بھی رہا ہے اور سنگین بھی، اس دوران صرف اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ جب کہ مذہبی شناخت کی برقراری اور دینی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے بھی متعدد جنگیں اس بنیاد پر لڑی گئیں کہ ہر فرد یا قوم خود کو مذہبی اعتبار سے برتر (برحق) سمجھتی تھی۔ ابراہیم (علیہ السلام) اور نمرود، موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون، محمد مصطفیٰ (ﷺ) اور ابوجہل تاریخ کے دورُخ ہمیشہ سے اس لیے الگ الگ بیان ہوئے کہ ان میں سے ہر فریق جداگانہ مذہبی وسماجی نظریات رکھتا تھا۔ اب ان میں سے کوئی بھی فریق عقلی بنیادوں سے ہٹ کر کوئی بھی عمل انجام دے تو وہ دہشت گرد متصور ہوگا اور جو عقل اور منطق کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانیت کی فلاح کا ضامن بن جائے تو وہ پیغمبر، مصلح اور امن پسند تصور ہوگا۔ بعد کے زمانے میں یہی معیار تاریخ کے ہر صفحے پر نظر آنے لگا۔ بلکہ یہ کہا

جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سیاست سے بڑھ کر مذہب زیادہ میدان عمل میں رہا۔ مذہبی تنازعات کی کئی مثالیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ خود مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان قریباً دوسو سال تک جنگیں لڑی گئیں جو آج بھی تاریخ میں ''صلیبی جنگوں'' کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ صلیبی جنگوں کے مُحرکات سیاسی قطعاً نہ تھے۔ بلکہ یہ جنگیں مقدس نام (مذہب) سے منسوب کر کے لڑی گئیں اور ان کی سرپرستی پاپائیت نے کی۔١٦ لہٰذا انسانی سماج کے تمام تر معاملات، چاہے ان کا تعلق سیاست سے ہو، مذہب سے ہو یا قومیت سے ہرصورت بہترین طرزِ زندگی کا حصول ہر فرد کی خواہش اور اولین ضرورت رہی ہے۔ صرف سیاست میں ہی پیدا شدہ اتھل پتھل جیسی صورت کو دہشت گردی قرار دینا موضوع کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے بھی زیادہ جان بوجھ کر ایک روشن حقیقت کو پس پشت ڈالنے اور بھیانک سازش کو پنپنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے جس کی باریکیوں سے آج کا انسان، خاص طور پر مسلمان ناآشنا ہے۔

امریکی محکمہ ریاست (*U.S State of Department*) نے بھی اسی سے ملتی جلتی تعریف بیان کی ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ایک پہلو کو اجاگر کر کے دیگر کئی پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کا عمل ایک پوشیدہ شرارت (دہشتگردی) کی نشاندہی کر رہا ہے۔

> ''The term ''terrorism'' means premeditated, politically motivated violence perpetrated against non-combatant targets by subnational groups or clandestine agents. Usually intended to influence an audience."17
>
> ''دہشت گردی سے مراد سیاسی محرکات کے تحت تشدد پر مبنی سوچی سمجھی کاروائی ہے جو نیم حکومتی گروہ یا خفیہ کارندے کریں اور جس کا نشانہ غیر مقاتل افراد بنیں۔ اس کاروائی کا مقصد بالعموم کسی خاص گروہ پر اثرانداز ہونا ہوتا ہے۔''

اس تعریف میں بھی صَرفِ نظر سے کام لیا گیا ہے اور صرف سیاسی نظام میں خلل کو دہشت گردی کہا گیا ہے، جبکہ پچھلے ایک عشرے سے ''دہشت گردی'' کے خلاف جاری جنگ کے کیا سیاسی مُحرکات تھے، یہ آج تک تعین نہ ہوسکا۔ اگر ورلڈٹریڈ سینٹر پر حملے کرنے والے دہشت گرد مسلمان تھے تو ان کے مطمع نظر صرف مذہبی محرکات تھے نہ کہ سیاسی، انہوں (دہشت گردوں) نے فرض کر لیا تھا کہ وہ مسلم اُمہ کی حفاظت کرنے اور ان کے ساتھ روا رکھے گئے ظلم کا بدلہ لینے چلے ہیں۔ بقول ان ''دہشت گردوں'' کے امریکہ چونکہ مسلمانوں کا دشمن ہے، لہٰذا بدلہ لینے اور امریکیوں کو سبق سیکھانے کیلئے یہ اقدام اٹھایا۔ اُن کے تیئں فلسطین اور دیگر متاثرہ علاقے جہاں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے اس کا سدباب اس طرح کے حملوں سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام کے تمام مفروضات صرف ایک قوم کی حفاظت کے لیے وضع کیے گئے

بعدازاں انہی مفروضات کی بنیاد پر امریکہ دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنا۔ ان دہشت گردوں نے صرف مذہب کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا اقدام اٹھایا جبکہ زمینی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ ان حملوں میں سیاسی محرکات کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف سیاسی محرکات ہی دہشت گردی کا سبب بنتے ہیں؟ تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا میں اب تک صرف مذہبی محرکات کی بنیاد پر ہی جنگیں لڑی گئیں اور باہمی تنازعات کا بازار گرم رہا۔ البتہ جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم کے پس پردہ حقائق کی روشنی میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ان جنگوں کے وقوع پذیر ہونے میں چند سیاسی محرکات ضرور تھے۔ خاص طور پر جرمن قوم پرستی نے جنگ کے شعلے بھڑکا دیئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ جرمنی سمیت فرانس، امریکہ، روس اور دیگر اتحادیوں میں اکثریت کا تعلق عیسائیت سے تھا۔ جاپان اس جنگ میں کودا تھا تو اس کی وجوہات بھی سیاسی یا معاشی مقاصد کا حصول تھا۔ صرف یہی وہ دور ہے جہاں مذہب باہمی نزاع کا باعث نہیں بنا جبکہ ان جنگوں میں قوم پرستی بھی نظر آئی، معاشی مقاصد کا حصول بھی پوشیدہ نظر آیا اور مفادات کا باہمی ٹکراؤ بھی۔ اس دوران اگر کسی کا براہ راست کردار نہ تھا تو وہ مذہب کا تھا۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی دانشور نوم چومسکی نے دہشت گردی کو دو مختلف معنوں میں بیان کیا ہے۔ ایک لغوی معنی اور دوسرا عام معنی (عام سے مراد مقتدر طاقتوں کی جانب سے وضع کردہ تعریفات ہیں) دہشت گردی کا لغوی تصور یوں بیان کیا ہے: ''دہشت گردی تشدد کی دھمکی کا نپا تُلا استعمال ہے جو دباؤ ڈال کر اور جبر یا خوف پیدا کر کے سیاسی، مذہبی یا نظریاتی اہداف حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔'' ان کے نزدیک دہشت گردی کی عام تعریف یہ ہوسکتی ہے: ''جو کوئی بھی امریکہ، اس کے دوستوں اور اس کے حلیفوں کے خلاف ہے وہ دہشت گرد ہے۔''[18]

نوم چومسکی کی طرف سے بیان کردہ تعریف سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں:

۞ آج کے زمانے میں ہر طاقت ور انسان غریب اور کمزور آدمی کو (حکم نہ ماننے پر) دہشت گرد سمجھتا ہے۔

۞ مقتدر طاقتیں معاشی حصول کیلئے کسی بھی ملک، قوم اور ریاست کو دہشت گرد سمجھتی ہیں۔

۞ مفروضات پر مبنی نظریات کی بنیاد پر کسی قوم، ملک، ملت اور مذہب کو دہشت گردی سے منسوب کرنا استعماری طاقتوں کا طاقت ور حربہ بن گیا ہے۔

۞ اقتدار اور مال و دولت کی لالچ انسانی حواس کو ٹھکانے میں رہنے نہیں دیتی۔ سازشی نظریات اور خفیہ میٹنگوں کے ذریعے پہلے راہ ہموار کی جاتی ہے بعدازاں دہشت گردی کا لیبل لگا کر حکم نہ ماننے والے ''دہشت گردوں'' کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کیا جاتا ہے، عراق اور افغانستان اس کی واضح ترین مثال ہے۔ جب کہ آج شام میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

۞ پچھلے ایک عشرے کے دوران دہشت کے گردی کے نام پر لاکھوں لوگوں کی جانیں اس لیے لی گئیں کہ وہ لوگ امریکہ و مقتدر قوتوں کے حکم پر لبیک نہیں کہتے تھے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں دہشت گردی کی تعریف یوں وضع کی گئی: ''وہ ظلم و زیادتی جو انسان کے دین، عقل، مال اور عزت پر افراد، تحریکات اور جماعتوں کی جانب سے کی جائے۔ اس میں خوف و ہراس، ایذا رسانی، تہدید و تخویف، ناحق قتل، راستوں کو پرخطر بنانا اور رہزنی اور ڈاکہ زنی جیسی تمام صورتیں داخل ہیں اور ہر وہ دہشت اور دھمکی آمیز اقدام جو کسی ایسی انفرادی یا اجتماعی مجرمانہ منصوبہ بندی کے نفاذ کیلئے ہوتا ہو جس کا مقصود لوگوں میں خوف پھیلانا، انسانی جان کی آزادی اور امن وسکون کو خطرے میں ڈال کر ڈرانا دھمکانا، اسی طرح ملک کے کسی خطے کو، رفاہ عامہ کی چیزوں کو یا عوامی یا ذاتی ملکیتوں کو نقصان پہنچانا یا سرکاری اور قدرتی ذرائع آمدنی کو تباہ و برباد کرنا۔'' ۱۹

مندرجہ بالا تعریف عمومی طور پر دہشت گردی اور اس سے ملحقہ اقدامات کی بھرپور تشریح کرتی ہے۔ صرف ایک ہی معاملہ کو دہشت گردی کے زمرے میں شامل کرنے کی بجائے اُن تمام معاملات کو دہشت گردی کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے جو انسان اور انسانیت کیلئے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تعریف ایک ایسے مذہب کی طرف سے بیان کی گئی ہے جو بذاتِ خود دہشت گردی کا سب سے بڑا شکار رہے۔ لہٰذا مفصل اور جامع ہونے کے باوجود دنیا کی ہر قوم یا مذہب کیلئے یہ قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً لحہ بہ لحہ بدلتی دنیا اور پے در پے وقوع پذیر ہونے والے واقعات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں، یقینی بات ہے کہ دنیا جس طرح اسلام اور ان کی تعلیمات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر ان کے ماننے والوں کی طرف سے بیان کردہ کسی نظریہ کو کیوں کر قبول کرے گی؟

اوپر درج کی گئیں دہشت گردی کی تعریفات کو سیاسی محرکات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے جزئیات کے طور پر کچھ نکات بیان کئے کہ دہشت گردی کی تعریف کو صرف سیاسی اکھاڑے تک محدود کرنے کا عمل ایک سازش کے سوا کچھ نہیں۔ ایک ایسا مفہوم جس کی وسعت بہت زیادہ ہوسکتی تھی اور ہے، صرف ایک ہی پہلو تک محدود کرنا اس عمل کی نشاندہی ہے کہ مذہبی اور دیگر سماجی معاملات میں ہونے والے تنازعات، جارحیت، دھمکیاں اور دھونس جیسے محرکات قابل اعتناء ہیں اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور پس پردہ محرک امریکی جارحیت کے ان تمام مظالم کی پردہ پوشی بھی ہے جن کا تعلق افغانستان اور عراق جنگ سے تھا۔ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے دہشت گردی کے خلاف اعلان کردہ جنگ کی آڑ میں پہلے افغانستان پر حملہ کیا۔ افغانستان پر الزام یہ تھا کہ اس نے اسامہ بن لادن جیسے ''بین الاقوامی دہشت گرد'' کو پناہ دی ہوئی ہے۔ تحقیقات وسفارشات اور مذاکرات سے رجوع کئے بغیر افغانستان پر جارحیت کی گئی اور نام ونہاد دہشت گردی کی آڑ میں افغانستان امریکی ''دہشت گردی'' کا شکار ہوا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ افغانستان ایک مسلم ملک تھا۔ بطور جارح افغانستان میں داخل ہوئے امریکہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کو عراق میں مشکوک ''سرگرمیاں'' نظر آئیں۔ عراق پر سب سے بڑا الزام کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا تھا۔ انہوں نے اس قدر مہم چلائی کہ اقوام متحدہ سمیت

دیگر کئی ممالک اس بات کے حامی نظر آئے کہ عراق اگر کیمیائی ہتھیار تیار کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ یقینی طور پر دہشتگردی کے لیے استعمال ہوں گے۔ اس پروپیگنڈہ نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو عراق پر حملہ کرنے کا ایک یقینی ماحول فراہم کیا عراق پر امریکی حملہ دہشت گردی کی عام تعریف کی عملی صورت تھی جس کا تذکرہ مشہور دانشور نوم چومسکی نے کیا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ نوم چومسکی، کے خیال میں دہشت گردی کی ایک تعریف امریکی حکومت اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے اور ان کی نظر میں ہر وہ فرد یا ملک دہشت گرد ہے جو ان کی حکم عدولی کرتا ہے۔ نائن الیون کے فوراً بعد امریکہ کو اس ''اصول'' پر بھرپور عمل کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے دوٹوک الفاظ میں دھمکی تھی: ''دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے کو اب فیصلہ کرنا ہوگا یا تو آپ ہمارے ساتھی ہیں یا پھر دہشت گردوں کے۔''

''Every nation in every region now has a decision to make,either you

either you are with us or you are with the terrorists" ۲۰

سابق امریکی صدر کا خطاب آئندہ دنیا کی واضح تقسیم کا موجب بنا۔ اگرچہ اس جنگ کا اعلان دہشت گردوں کے خلاف تھا لیکن اس بات کی وضاحت نہیں ملی کہ وہ دہشت گرد کون تھے؟ البتہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے محرکات واضح طور پر ایک قوم (مسلمان) کے خلاف نمایاں نظر آئے۔ حالانکہ نائن الیون حادثے کے ذمہ داروں کا تعلق مسلمانوں سے تھا تو بھی یہ حقیقت نہیں تھی کہ پوری قوم یا مذہب اس قسم کے نظریات کی حامی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ نائن الیون کے حملہ آوروں میں سے اکثر نے سیکولر ایجوکیشن حاصل کر رکھی تھی جو سطحی اسلامی علم کے ساتھ امتزاج کے بعد انتہا پسند آئیڈیالوجی کی صورت میں نمودار ہوئی۔''۲۱ انفرادی اقدامات کا اجتماعیت سے کوئی تعلق نہیں یہ تو دنیا کی ہر قوم جانتی ہے، اس کے باوجود فرضی بنیادوں پر مسلمان قوم کو دہشت گردی کی طرف منسوب سمجھنا اس بات کی علامت تھی کہ امریکی اقدامات کے تانے بانے بہت پہلے بُنے جا چکے تھے۔

تمہیدی بحث اور دہشت گردی کی تعریفات کے تناظر میں واضح ہوا کہ آج پوری دنیا میں دہشت گردی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف دنیا کے طول و عرض حصے میں جانوروں مثلاً کتے، بلی، ہرن سے پیار کرنے اور جانے بچانے کے کئی واقعات میڈیا میں آ رہے ہیں تو دوسری طرف اسی دنیا کے کئی حصوں میں دہشت گردی کے نام پر انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے۔ ڈاکٹرائن نما سوچ دہشت گردی کو پروان چڑھانے کا سبب بن رہی ہے۔ غریب اور کمزور افراد کا انکار مقتدر قوتوں کے لیے سب سے بڑی گالی ہے، لہٰذا اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ قوتیں دہشت گردی کو پنپنے کا موقع دے رہی ہیں۔ لہٰذا یہ بات تو یقینی ہے کہ کوئی تو ایسی قوم یا قوت ہے جو پسِ پردہ دہشت گردی کو بڑھاوا دے رہی ہیں، فی الحال و قوت ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔

پاکستان میں دہشتگردی کے مُحرکات:

افغانستان کے پڑوس میں ہونے کے ناطے پاکستان کا دہشت گردی کے خلاف جنگ سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔اس فطری تعلق سے بھی زیادہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان وہ ''معاشقہ'' بھی کارفرما تھا جب ۱۹۷۹ء میں روس افغانستان پر حملہ آور ہوا۔گوکہ روسی جارحیت خود ایک ''دہشت گردی'' تھی لیکن جہاد کے نام پر پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک کو اس جنگ میں گھسیٹ لانا امریکہ کا ہی کارنامہ تھا۔اس صورت حال کو جب کہ روس جارح تھا اور افغانستان اس کا شکار، بدیہی طور پر اس لیے نظرانداز نہیں کرسکتے کیوں کہ یہی اقدام بعد کے حالات میں دہشت گردی کی بنیاد بنا۔لہٰذا اعتراض یہ نہیں ہے کہ پاکستان افغان جنگ میں کیوں ملوث ہوا۔سوالیہ نشان یہ ہے کہ امریکہ نے اس جنگ کی پشت پناہی کیوں کی؟ اس جنگ میں امریکی شرکت نے جہاں پاکستان اور افغانستان کی جہادی کوششوں کو سوالیہ نشان بنادیا وہیں پاکستان کی سالمیت کو سنگین خطرات بھی لاحق ہوگئے۔تب سے لے کر اب تک پاکستان مسلسل دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔اب ہم ان محرکات کو بیان کرتے ہیں جو پاکستان میں دہشت گردی کی وجہ بنے:

(۱)افغانستان کے ساتھ پاکستان کے قدیم دینی، نسلی، قبائلی تعلقات کے علاوہ لوگوں کے خاندانی رشتے بھی ہیں۔روسی جارحیت کے بعد افغانیوں کے شانہ بشانہ پاکستانیوں کا لڑنا ایک مجبوری تھی۔اس کے علاوہ جنگ کے بعد ۴۰ لاکھ افغان پناہ گزیں جو دنیا میں پناہ گزینوں کی سب سے بڑی آبادی ہے، پاکستان آکر آباد ہوئے۔لہٰذا پاکستان کو اس جنگ کی وجہ سے بہت بڑی سماجی اور معاشی قیمت ادا کرنا پڑی۔خصوصاً سوویت یونین کے شکست پر مبنی انخلاء کے بعد امریکیوں کی عجلت یا منصوبہ بندی کے تحت واپسی نے پاکستان کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا۔یوں پاکستان ایک ایسی صورت حال میں داخل ہوا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔افغان مہاجرین میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سخت ترین روش کے حامل تھے۔انہوں نے اپنے نظریات کو پاکستانی معاشرے پر تھوپنے کی کوشش کی۔ناکامی کی صورت میں وہ شدت پسندی پر اتر آئے اور یہیں سے پاکستان میں دہشت گردی کا آغاز ہوا۔[۲۲]

(۲)۸۰ء کی دہائی میں مذہبی انتہا پسندی سابق صدر ضیاءالحق کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے زور پکڑتی گئی۔اس جہاد میں صوبہ سرحد کے مذہبی افراد شریک تھے کیوں کہ افغان پختون اسلام کی بنیادی اور خالص تشریح پر یقین رکھتے ہیں۔جنرل ضیاء الحق (سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان) نے اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کے اندر اور بیرون ملک بے لچک مذہبی جماعتوں کا حلقہ بنالیا جس سے پاکستان کی بہت بڑی اکثریت کا تعلق نہیں تھا اور یہ مذہبی حلقہ بعد میں شدت پسندی کی طرف مائل ہوا۔

(۳)سوویت یونین کی شکست کے بعد امریکی اجارہ داری کے اثرات نظر آنے لگے۔ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت

امریکہ اور یورپ خطے کو اپنے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔ مخلوط حکومت کی صورت میں ایک کمزور حکومت قائم ہوئی جس کی موجودگی میں افغان قبائلی آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے اور ان کے درمیان خون خرابہ آخری حدوں کو چھونے لگا۔ افغانستان میں طویل داخلی جھگڑوں کے اثرات پاکستان میں یوں ظاہر ہوئے:

۞ افغان مہاجرین کی کثیر تعداد پاکستان آئی

۞ ایک خاص نظریہ کی حامل جماعت (طالبان) کا وجود عمل میں آیا

۞ طالبان اور دیگر علاقائی تنظیموں کا القاعدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم سے الحاق ہوا

(۴) افغان جنگ میں پاکستان کے مضبوط اور دلیرانہ کردار کئی ''عالمی طاقتوں'' کو کھٹکنے لگا۔ اس لئے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کیلئے ہندوستان سمیت کئی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں متحرک ہوئیں۔ اس سلسلے میں ملک دشمن عناصر کو بھرپور استعمال کیا گیا۔ بم دھماکے، قتل و غارت گری اور دیگر خونی واقعات جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے کے پس پردہ بیرونی ہاتھ کا ملوث ہونا مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ آج بلوچستان کے خراب ہوتے حالات اس کڑی کی اہم مثال ہے۔

(۵) نائن الیون حادثے نے دنیائے سیاست کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ امریکی حکومت کی طرف سے باقاعدہ اعلانِ جنگ کے بعد ایک حکم نامہ جاری کر دیا گیا کہ ''دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے کو اب فیصلہ کرنا ہوگا یا تو آپ ہمارے ساتھی ہیں یا پھر دہشت گردوں کے۔'' ۲۳؎ اپنے موقف کی مزید توثیق کیلئے امریکہ نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے ۲۸ رستمبر ۲۰۰۱ء کو ایک قرارداد (نمبر ۱۳۷۳) پاس کروائی۔ ۲۴؎ اقوام متحدہ کے ممبر ہونے کے ناطے پاکستان نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی اور پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا۔ وہ قوتیں جو افغان جہاد میں برسرِ پیکار رہی ان کو پاکستان کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ وہ پاکستان کی اس پالیسی کے خلاف ہوگئیں۔ لہٰذا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی شمولیت بھی ملک میں دہشت گردی کے اضافہ کا سبب بنی۔

(۶) انقلابِ ایران کے اثرات بھی پاکستان میں نمایاں طور پر دیکھے گئے۔ ایرانی رہنماء آیت اللہ امام خمینی کے دعویٰ کے مطابق: ایرانی انقلاب کسی خاص گروہ یا فرقہ سے منسوب نہیں تھا بلکہ یہ تحریک ایرانی ہونے سے پہلے ایک اسلامی تحریک تھی۔'' ۲۵؎ اس دعویٰ کے باوجود ایرانی انقلاب کو ایک خاص مکتبہ فکر سے منسوب کر کے ردِعمل کے طور پر پاکستان میں مذہبی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ بعد ازاں ایرانی انقلاب سے متاثر تنظیموں اور انقلاب کی مخالف تنظیموں کے درمیان نظریات اختلافات کھل کر سامنے آ گئے اور نوبت قتل و غارت گری تک جا پہنچی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

(۷) لال مسجد آپریشن بھی دہشت گردی میں اضافہ کا سبب بنا۔ پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد کے قلب میں واقع مشہور مسجد ''لال مسجد'' اور مدرسہ ''مدرسہ فریدیہ و جامعہ حفصہ'' کے خلاف حکومتِ وقت کی کارروائی پاکستان میں خودکش حملوں میں

مزید اضافہ کا باعث بنی۔اس آپریشن کے اسباب و وجوہات پر بحث سے قطع نظر یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ نے پاکستان کو نہ صرف جانی و مالی نقصان پہنچایا بلکہ اس کی بنیادیں بھی ہلا کر رکھ دیں۔
(۸) پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات میں سے ایک بڑا محرک پاکستان پر امریکی ڈرون حملے ہیں۔ان حملوں کا آغاز ۲۰۰۴ء میں ہوا اور ان کا سلسلہ نواز شریف حکومت کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا۔ان ڈرورن حملوں کے ردِعمل میں پاکستان کے بڑے شہروں کو ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ملک میں ہونے والے اکثر دھماکوں اور حملوں کی ذمہ داری طالبان نے قبول کر لی ہے۔۲۶

مبحثِ سوم مدارس کا عمومی کردار:

دینی مدارس کا نظام جس دور میں برصغیر میں رائج ہوا تھا اُس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے اس کی ایک افادیت تھی۔ یہ نظامِ تعلیم دراصل اُس عہد کے سول ملازمین کی تربیت کے لیے مرتب کیا گیا تھا جس طرح آج سول سروس اکیڈیمی وغیرہ میں سرکاری افسران کی تربیت کے لیے تعلیمی پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اُس زمانے میں اسلامی نظام حکومت کے اداروں میں جاری وساری تھا اور اسلامی قانون بھی نافذ تھا، لہٰذا قدرتی بات تھی کہ اس نظامِ تعلیم میں دینی علوم کا حصہ بھی شامل کر لیا گیا لیکن نصاب میں زیادہ حصہ منطق، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور اس طرح کے دوسرے علوم پر مشتمل تھا جو لوگ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے تھے وہ حکومت کے اہم مناصب پر فائز ہوتے تھے اور اس طرح طلبہ مدارس میں جو کچھ پڑھتے تھے اُسے عام زندگی میں استعمال بھی کرتے تھے۔

اب المیہ یہ ہوا کہ دینی تعلیم کا یہ نظام اپنی ابتداء سے لے کر آج تک اُس ڈگر پر چل رہا ہے جس پر اُسے ایک خاص دور کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر صدیوں پہلے مرتب کیا گیا تھا۔ خیال یہ ہے کہ اس نظام میں نشو ونما اور ترقی کے امکانات موجود تھے لیکن ان امکانات سے فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔اب حالت یہ ہے کہ زمانہ ایک طرف جا رہا ہے تو یہ مدارس کا نظام دوسری طرف۔ یہ نظام نشو ونما ترقی اور تبدیلی سے یکسر محروم ہے۔ابھی تک ان مدارس میں فلسفہ اور منطق کے نصاب میں وہ یونانی نظریات پڑھائے جا رہے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں۔ مدارس کے منتظمین کا فرض تھا کہ وہ حسبِ ضرورت نصاب میں تبدیلیاں کرتے رہتے، غیر ضروری کتب اور علوم کو حذف کرتے رہتے اس طرح یہ نظام ترقی کرتا اور موجودہ عہد کی ضروریات کو بھی پورا کرتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس سے قبل ان مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ ووکیشنل ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔مثلاً اس نصاب میں طب کی تعلیم بھی شامل تھی۔آہستہ آہستہ یہ روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے بلکہ ختم ہو چکی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں معاصر علوم میں دن رات ترقی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور نت نئے طریقے سے ان علوم کی ترقی کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

دینی طلبہ کا معاشرتی پسِ منظر:

اس سے قبل اسلامی حکومتیں ان مدارس کی سرپرستی کرتی تھیں اور انہیں مالی وسائل مہیا کرنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اب یہ مدارس محض انفرادی خیراتوں پر چل رہے ہیں، اس لیے معاشرے کے صاحبِ ثروت لوگ اپنے بچوں کو یہاں نہیں بھیجتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ جو مسائل کی کمی کے باعث اپنے بچوں کو اسکولوں اور کالجوں میں نہیں بھیج سکتا۔ انہیں دینی مدارس میں بھیج دیتا ہے۔ خود طالب علم بھی اپنی اس مجبوری سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کا تلچھٹ ان مدارس کے حصے میں آتا ہے۔ یہ معاشی اور معاشرتی پس منظر طلبہ اور اساتذہ میں احساسِ کمتری کو پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں یہ لوگ معاشرے میں کوئی اہم اور موثر رول ادا نہیں کر سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مدارس کے فارغ التحصیل افراد کی ذہنی سطح ایک خاص مدت سے آگے نہیں جاتی۔

دینی مدارس کا ماحول:

دینی مدارس کے بارے میں یہ جو تاثر پایا جاتا ہے کہ طلبہ میں دینی جذبہ پروان چڑھایا جاتا ہے تو یہ بھی بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ عربی دینی مدارس کے طلبہ کی عام دینی اور اخلاقی حالت معاشرے کے دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ بد اخلاقی اور بدکرداری کے واقعات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں کچھ دخل تو مدارس کے داخلی نظام اور ماحول کا بھی ہے، کچھ طلبہ و اساتذہ کے معاشی اور معاشرتی پس منظر سے ہے اور کچھ دخل نصابی کتب کو بھی ہے۔ مثلاً عربی ادب کے نصاب میں ''نفحۃ الیمن'' نام کی جو کتاب طلبہ کو ابتدائی سالوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ بے ہودہ، فحش اور بے کار افسانوں اور قصوں پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عمر کے اس حصے میں طلبہ اس طرح کی کتابیں پڑھیں گے تو وہ کس طرح کا اخلاق سیکھیں گے۔

تبدیلی کے تجربات:

ندوہ میں اس نصابِ تعلیم میں حذف و اضافے اور تبدیلی کا بہت عمدہ تجربہ کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ندوہ کی یہ روایت پاکستان میں منتقل نہ ہو سکی۔ پاکستان بننے کے بعد سیاسی جماعت ''جماعت اسلامی'' نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس ضمن میں کچھ تجربات کیے تھے۔ ملتان میں جامع العلوم کا قیام اور پنجاب میں منصورہ کا قیام اس سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں۔ منصورہ کا تجربہ بالخصوص کامیاب رہا، نہ صرف یہ کہ منصورہ میں نصابِ تعلیم قدیم اسلامی علوم اور جدید علوم کا بہترین امتزاج تھا بلکہ جو اساتذہ رکھے گئے وہ بھی قدیم و جدید دونوں طرح کے علوم کے جامع تھے لیکن اب ان مدارس کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور ان کی انفرادی حیثیت کو ختم کر کے انہیں عام تعلیم کے نظام میں ضم کر دیا گیا ہے۔ ان دو اداروں کے علاوہ جماعتِ اسلامی کے افراد متعدد شہروں میں ایسے اسکول اور کالج چلا رہے تھے جہاں عام تعلیمی نصاب

کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن یہ اسکول اور کالج بھی اب حکومت کی تحویل میں چلے گئے ہیں۔

مدارس میں تبدیلی کی صورت:

علماء کو جو بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ بھی معاشرہ کے فرد ہیں، انہیں بھی اسی معاشرے میں رہنا، ملنا جلنا اور اُٹھنا بیٹھنا ہے، ایسی صورت میں وہ اپنے معاشرے کے مسائل سے کیسے بے گانہ رہ سکتے ہیں؟ انہیں اپنے معاشرے کے مسائل کو سمجھنا ہوگا، اُس صورت حال اور اُن عوامل کو سمجھنا ہوگا جن کے نتیجے میں یہ مسائل پیدا ہوئے ہیں اور ان سب چیزوں کو اپنے نصاب میں داخل کرنا ہوگا۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دینی مدارس میں اولین اہمیت تو دینی علوم کو دی جائے۔ لیکن عام جدید علوم بھی ثانوی حیثیت سے پڑھائے جائیں۔ دوسری صورت یہ کہ عام تعلیمی اداروں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور فنی تعلیم کے اداروں میں اولیت تو اُن علوم کو دی جائے جن میں کوئی طالب علم تخصیص حاصل کررہا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی مبادیات بھی اُسے پڑھادی جائیں۔ اگر علماء معاشرے میں علمی اور عملی رہنماء کی حیثیت سے کوئی موثر رول ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں جدید علوم سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی۔ اگر وہ جدید علوم سے اسی طرح بے گانہ رہے جس طرح کہ آج ہیں تو بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ وہ دینی کام بھی نہیں کرسکیں گے۔ جو علماء درسِ نظامی میں تبدیلی کے مخالف ہیں اور جدید علومِ عمرانیات کو غیر دینی علوم قرار دے کر یہ کہتے ہیں کہ ان کے شامل کرنے سے دینی اداروں کے تقدس پر حرف آئے گا، اُن سے سوال یہ ہے کہ پھر درسِ نظامی میں پہلے سے یہ غیر دینی علوم کیوں شامل ہیں؟ اگر پہلے سے غیر دینی علوم شامل ہیں تو اب نئے غیر دینی علوم کیوں شامل نہیں کئے جاسکتے ہیں؟ اگر دینی مدارس میں فارسی اور اُردو پڑھائی جاسکتی ہے جو اسلامی زبانیں ہرگز نہیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ انگریزی بھی کیوں نہیں پڑھائی جاسکتی؟ پھر ان مدارس میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے وہ بھی قدیم عربی ہے۔ عربی مدارس کے طلبہ جدید عربی سے یکسر نابلد رہتے ہیں بلکہ قدیم عربی سے بھی، یہ طلبہ نہ عربی لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔

مدارس اور سماجی تبدیلی:

راقم الحروف کا خیال ہے کہ کوئی اسلامی انقلابی یا سماجی تبدیلی ان مدارس کے راستے نہیں آسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرے میں اپنا فعال اور موثر کردار کھو چکے ہیں اور اب محض ایک روایت کو لے کر چل رہے ہیں جو دراصل جمود کی روایت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مدارس بتدریج تعلیمی معیار اور اخلاقی معیار کے اعتبارات سے مسلسل انحطاط اور تنزلی کے شکار ہیں۔ طلبہ کا علمی اور اخلاقی معیار مسلسل گرتا جارہا ہے۔

مدارس اور فرقہ بندی:

ان مدارس کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ ان میں اُصولیات اور کلیات پر اور اُن اُمور پر جن پر جمہور علمائے اسلام

کا اتفاق ہے کم توجہ دی جاتی ہے۔فروعی اور اختلافی مسائل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ان مسائل پر تقاریر کے لیے باقاعدہ مناظرہ بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔پھر یہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب امام یا خطیب بنتے ہیں تو منبر پر کھڑے ہو کر مخالفین کے خلاف زہر اُگلتے ہیں اور معاشرے میں اختلاف اور فساد کے بیج بوتے ہیں۔مسجدیں بھی اسی سے پہچانی جاتی ہیں کہ یہ بریلوی مسجد ہے، یہ دیو بندی ہے، یہ اہل تشیع ہے اور یہ اہلحدیث کی مسجد ہے۔علمی سطح پر تو ان فروعی اور اختلافی مسائل پر گفتگو کی گنجائش موجود ہے لیکن عام عوامی اجتماع میں ان مسائل کو چھیڑنا، عامۃ الناس کو ان بحثوں میں شامل کر کے اُن کو فریق بنانا اور ان کی تائید وحمایت سے باقاعدہ فرقے بنانا، اُمت میں انتشار کا باعث بن رہا ہے۔اس چیز کو اگر عوام کے دینی جذبات کا استحصال سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دینی مدارس، ایک تنقیدی جائزہ:

مدرسائی نظامِ تعلیم کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ نظام فرقہ بندی اور مسلکی بنیاد پر قائم ہے۔دیو بندی، بریلوی، اہلحدیث، جماعت اسلامی اور اہلِ تشیع کے سارے ادارے خالصتاً مسلکی بنیادوں پر قائم ہیں۔ان میں سے ہر مسلک کے علیحدہ امتیازی نشانات، لباس، نماز پڑھنے کا طریقہ اور معاشرتی رویئے ہیں۔کسی بھی دینی طالب علم یا اساتذہ کے لباس کو دیکھ کر با آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ہر ادارے کے اندر سارے اساتذہ کا تعلق اسی خاص مسلک سے ہوتا ہے۔چنانچہ جب ایک طالب علم آٹھ برس کسی ایک دینی درسگاہ میں گزارتا ہے تو مسلک پرستی پر مبنی سوچ اور رویئے اس کے ذہن میں پوری طرح راسخ ہو چکے ہوتے ہیں۔پھر وہ اپنے مسلک والوں کو ایک عینک سے دیکھتا ہے اور دوسرے مسالک کو کسی اور عینک سے دیکھتا ہے۔

ان مدارس کی دوسری خامی یہ ہے کہ ان میں داخل ہونے والے طالب علم کو عام طور پر اپنے پورے ماحول سے کاٹ دیا جاتا ہے۔کئی مدارس میں بچوں کو بالکل ابتدائی عمر سے ہی لے لیا جاتا ہے ایسے اداروں میں عام دنیوی تعلیم یا تو سرے سے دی ہی نہیں جاتی اور اگر دی بھی جاتی ہے تو طالب علم کو اپنے پورے ماحول سے کاٹ دیا جاتا ہے۔بعض اداروں میں آٹھویں جماعت یا میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو لے لیا جاتا ہے، چونکہ وہاں بھی ان کو اپنے ماحول سے مکمل طور پر کاٹ دیا جاتا ہے۔اس لئے یہ لوگ معاشرے کے اندر ایک بالکل علیحدہ طبقہ بن جاتے ہیں۔

اس نظامِ تعلیم کی تیسری خامی یہ ہے کہ اس میں حقیقی دینی تعلیم بہت کم دی جاتی ہے۔آٹھ برس کے پورے دور میں قرآن مجید کی تعلیم کو پانچ فیصد وقت بھی نہیں دیا جاتا۔اس وقت مدارس میں قرآن مجید کی دینی تفاسیر میں صرف ایک تفسیر ''جلالین'' پڑھائی جاتی ہے جو انتہائی مختصر تفسیر ہے۔اس کے تفسیری فقرے خود قرآن کریم کے فقروں سے بھی کم ہیں۔اس کے علاوہ بعض اداروں میں بیضاوی کا پہلا پارہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دینی مدرسے کی

ابتداء بھی قرآن مجید سے ہوتی۔

ایک اور خامی یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کا آدھے سے زیادہ وقت ان مضامین کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے جن کا دین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے اور جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ بھی آج سے کئی برسوں پہلے کی تحریر کردہ ہیں جن میں دی گئی مثالوں کا آج کے دور سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ مثلاً فقہ کی اکثر کتابوں میں ہر دوسری مثال غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہے، کیونکہ یہ کتابیں ایسے دور میں لکھی گئی تھی جس دور میں سب سے بڑی تجارت غلاموں اور لونڈیوں کی ہوتی تھی۔ درجہ بالا خامیوں کی وجہ سے پاکستان کے مذہبی اداروں کو درحقیقت مسلکی ادارے کہنا چاہیے جن کا سارا زور اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے پر ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ترمذی، ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، الجامع الکبیر (بیروت، دارُالغرب الاسلامی، ۱۹۹۶) ص ۸۵

۲۔ بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، ترجمہ مولانا عبدالرزاق دیوبندی، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، س ن) ص ۲۹۵

۳۔ محمد ۴۷/ ۱۹، ترجمہ پیر کرم شاہ الازہری

۴۔ ترمذی، ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، ترجمہ علامہ مولانا بدیع الزمان، (لاہور، نعمانی کتب خانہ ۲۰۱۲ء) ص ۴۲۳

۵۔ کیرانوی، مولانا وحیدُ الزمان، القاموسُ الجدید (لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۰ء بمطابق ۱۴۱۰ھ) ص ۲۹۶

۶۔ ایضاً ص ۲۹۶

۷۔ احمد بن حنبل، مُسند امام احمد بن حنبل (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، س ن) ج ۴، ص ۱۱۴

۸۔ نہرو، جواہر لال، دی ڈسکوری آف انڈیا (دہلی، یو کے جان ڈے، میری ڈیئن بکس، ۱۹۴۶ء) ص ۴۵

۹۔ کتاب الاستثناء، ج ۷، ص ۵، ۷

۱۰۔ متی، ج ۱۰، ص ۳۴۔۳۵

۱۱۔ بقرہ ۱/ ۱۹۰، سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۲۔ انفال ۸/ ۶۱، سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۳۔ سلمان پوری، قاضی محمد سلیمان، رحمۃ اللعالمین (فیصل آباد، مرکز الحرمین الاسلامی، ۲۰۰۷ء) ص ۱۳۵

۱۴۔ آکسفورڈ کنسائزڈ ڈکشنری آف پالیٹکس، ص: ۴۹۲، ۴۹۳

۱۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ص: ۶۵۰

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایل لینگر، ولیم، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عام، ترجمہ مولانا غلام رسول مہر (لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء) ج ۱، ص ۵۲-۵۳

18) United States department of state publication office of the coordinator for

counterterrorism released April 2008,"country reports on terrorism 2007"Pg:311

۱۹۔ حافظ مبشر حسین، جہاد اور دہشت گردی (لاہور، مبشر اکیڈمی، ۲۰۰۳ء) ص ۱۳۵ اسلامی فقہ اکیڈمی کی سولہویں کانفرنس، منعقدہ ۱۴۲۲ ہجری، زیر نگرانی رابطہ عالم اسلامی

۲۰ Bush,George W.(September20,2001)."Address to a Joint Session of Congress and the American People",The White House. Retrieved 2008-09-19.

۲۱۔ میاں انعام الرحمٰن، پروفیسر، جنوری ۲۰۰۵ء ، ''نائن الیون کمیشن رپورٹ: ایک امریکی مسلم تنظیم کے تاثرات کا جائزہ''، مشمولہ: ماہنامہ الشریعہ (گوجرنوالہ)، جلد: ۱۶، شمارہ: ۱، ص ۴۸

۲۲۔ ساگر، طارق اسمٰعیل، لال مسجد، آپریشن سائلنس (لاہور، محمد سید شاہ پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۳، ۲۴

۲۳۔ یوسف زئی، عقیل، طالبانائزیشن (لاہور نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۷۹

۲۴۔ اس موقف کا اظہار سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے نائن الیون حادثے کے فوراً بعد امریکی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا، جس کا حوالہ ہم سطور بالا میں دے چکے ہیں۔

۲۵ AlexConte,"Human rightin the prevention and punishment ofterrorism", Springen Publisher London,2010,Pg 63-64.

۲۶۔ حمید انصاری، سخنِ بیداری، (تہران، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۶۲

۲۷ http//:www.org.articles/2009/Dec.2009.

Cutting the fuse: The explosion of global suicide terrorism and how to stop it,by Robert A. Pape and James K. Fledman, Library of Congress cataloging-in-Publication,2010,pg 156.